حافظ صفوان محمد چوہان

اردو میں لسانی تحقیق: نظریات کی تشکیل اور بازتشکیل

In the realm of fresh theoretic works on the body of general & applied linguistics in Urdu, Faiza Butt's dissertation stands top-tier due to its clear focus and presentation. Published in 2017, her book viz "Urdu men Lisaani Tehqiq" (Linguistic Research in Urdu: اُردو میں لسانی تحقیق) starts from study of traversing the roots of languages & dialects but soon it seizes your attention because of boldly developing a series of unambiguous and crystalline hypotheses. At every point this young scholar seems not content with only summarizing the discussion but dares to state her very own standpoint in much weighed & measured yet fancy lexis. Writer of this cursory article hopes igniting academic discussions on the subject matter thanks to this scholarly work of the first order.

یادش بخیر ونامش بسلامت، جنابِ مشفق خواجہ اِس بے پایاں پر بہت محبتیں نچھاور کرتے تھے اور کبھی کبھی سنجیدہ مذاق بھی کرلیا کرتے تھے۔ اردو سے میرا رومانس شروع ہوا تو ایک دن فرمایا کہ حافظ صاحب، آپ ایک کتاب لکھیے ''ہری پور میں اردو''۔ (یہ اواخر ۲۰۰۱ء کی بات ہے اور اُن دنوں میری پوسٹنگ ہری پور میں تھی۔) دریافت کیا کہ اِس کتاب سے کیا ضرورت پوری ہوگی؟ ارشاد ہوا کہ اردو سیکھنے لکھنے میں آپ کا ذوق شوق دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ اردو کی پیدائش ہری پور میں ہوئی ہے۔ اِس کتاب میں تحقیق سے یہ ثابت کرنا ہوگا کہ اردو کا جنم بھوم ہری پور ہے۔ اور یہ ثابت کرنا کچھ مشکل نہیں۔ ہری پور کے آس پاس کسی پرانی درگاہ یا مسجد پر لگا ہوا کوئی پتھر تلاش کیجیے جس پر امیر خسرو کا کوئی شعر کندہ ہو، اور وہاں کے متولی سے انٹرویو کیجیے جس میں اُس سے یہ کہلوا لیجیے کہ یہ پتھر امیر خسرو کے زمانے سے لگا ہوا ہے۔ اُس پتھر کی تصویر اور متولی کے انٹرویو کا یہ جملہ یعنی یہ موادِ تحقیق لے کر ڈاکٹر فلاں کے پاس چلے جایئے۔ وہ اِتنے اِتنے روپوں کے عوض ''ہری پور میں اردو'' لکھ کر آپ کے حوالے کردیں گے۔ اور اگر یہ کتاب آپ اپنے نام سے چھپوانا چاہیں تو حق التحقیق ذرا زیادہ لیں گے۔ اِس پر طویل قہقہہ باری ہوئی اور پھر جو خواجہ صاحب نے نظریۂ ضرورت کے تحت اردو کی پیدائش کے بارے میں نظریہ سازی کرنے والے نظریات فروشوں کی نام بنام دھلائی کی کہ نہ پوچھیے، بس اللہ دے اور بندہ لے۔

برس دن گزرے، مجھے لفظاً لفظاً تو یاد نہیں لیکن یہ ہمیشہ یاد رہے گا کہ اُنھوں نے نصیر الدین ہاشمی کی دکن میں اردو کے حوالے سے بتایا تھا کہ فلاں فلاں محقق نے اِس کتاب کے ٹائٹل سے دھوکہ کھا کر لکھا ہے کہ ہاشمی صاحب نے اردو کا جنم بھوم دکن کو بتایا ہے جب کہ اِس کتاب میں جنوبی ہند میں اردو ادب کی روایت کا ذکر مذکور ہے۔ اِس کے بعد سے میں نے یہ بات پکڑ لی اور جب بھی کسی صاحب کی اردو کی پیدائش کے بارے میں تحریر پڑھی، اُس کی تحقیقی اصالت کو جنابِ

مشفق خواجہ کے بتائے اِسی نکتے کی کسوٹی سے جانچا گیا۔ یوں کچھ نام محققین کی پنگت سے باہر ہوگئے۔

ابھی چند ماہ پہلے ڈاکٹر فائزہ بٹ کی کتاب اردو میں لسانی تحقیق کا غلغلہ اٹھا تو میں حسبِ معمول اِسے ایک بلبلہ سمجھا اور مطالعے سے ہونے والے صدمے کی سہار نہ پا کر کتاب کی جلد اور ٹائٹل پر تجاہلِ عالمانہ سے بھرپور ایک مشفقانہ تبصرہ کر دیا کہ حاضری لگ جائے اور کسی ادبی مجلّے کے مدیر کی جانب سے مضمون لکھنے کا مطالبہ بھی نہ ہو، اور اگر کہیں کتاب کی رونمائی کی تقریب میں لب کشائی کرنا پڑ ہی جائے تو اِسی تبصرے کی لسی میں جناتی اردو کے چند پیڑے ڈال کر تقریباتی تنقید کی صنف میں ایک مضمون متھ دیا جائے۔ خیال تھا کہ باقی کتابوں کی طرح یہ کتاب بھی بہتر کتابوں کے لیے جگہ چھوڑ کر منظر سے ہٹ ہٹا جائے گی لیکن ایک روز پروفیسر عزیز ابن الحسن نے اِس پر اپنا تبصرہ فیسبک پر چاڑھ کر اس کا لنک مجھے وھاٹس ایپ میں بھیج دیا۔ تبصرے کی ابتدائی سطور سے معلوم پڑا کہ آں محترمہ عزیز صاحب کی شاگرد ہیں، تو اِس تحریر کو ایک استاد کی اپنی شاگرد کی پہلوٹھی کی کتاب پر تقریظی تنقید اور حوصلہ افزائی کا ٹوکن سمجھ کر نظر سے گزار دیا۔ البتہ کتاب کے بارے میں شک ہو گیا کہ اِس میں ضرور کچھ لائقِ اعتنا ہے ورنہ عزیز صاحب سوائے محمد حسن عسکری کے کسی پر تعریفی مضمون لکھ دیں، یہ کیسے ممکن ہے؟ اور پھر جب یہ معلوم ہوا کہ کتاب مغربی پاکستان اردو اکیڈمی سے شائع ہوئی ہے تو اِس کے قرار واقعی اچھا ہونے کا شک یقین میں بدل گیا؛ خواجہ محمد زکریا صاحب کا ادارہ دوسرے درجے کی کتاب شائع کر ہی نہیں سکتا۔

لیکن اصل آزمائش ابھی باقی تھی۔ ہوا یوں کہ ایک روز یہ کتاب ڈاک سے میرے پاس پہنچ گئی اور وہ بھی محترمہ کے دستخطوں سے مزین، کہ کوئی اِس پر مالِ مسروقہ کا حکم نہ لگا سکے۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، چند منٹ میں ڈھونڈ کر دکن میں اردو والا پیراگراف نکالا۔ محترمہ نے نصیرالدین ہاشمی کے بارے میں لکھا تھا: ''یہ سچ ہے کہ اُنھوں نے اپنی تحقیقات میں کہیں بھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ دکن اردو کی جنم بھومی ہے یا برِصغیر میں پہلے پہل اردو کی ابتدا دکن سے ہوئی''۔ جنابِ مشفق خواجہ کی عطا کردہ کسوٹی پر یہ کتاب کھری اتری تھی۔ میری آنکھیں کھل گئیں۔ دل میں بدگمانی کے پالن پر افسوس ہوا۔ کتاب پڑھنے کی نیت باندھ لی۔

تو صاحبو، وہ دن تھا اور آئندہ ایک پورا ہفتہ، سوا سات سو صفحات کی اِس گرنتھ صاحب کو پڑھنا مقدر کا لکھا سمجھ کر قبول کرنا پڑا۔ اور خدا شاہد ہے کہ یہ مطالعہ ایک مسلسل خوشگوار حیرت کا سبب ہوا۔ چیزیں بیشتر وہی تھیں جو پڑھ رکھی ہیں لیکن اِن پر تحقیق و تجزیہ کچھ ایسے سلیقے اور نئے پن کے ساتھ کیا گیا ہے کہ ایک لمحے کو بھی کہیں یہ احساس نہیں ہوا کہ یہ قندِ مکرر ہے۔ میں تحقیقی مقالات کو مزاحًا ایک جیسے گھروں کی کالونی سے تشبیہ دیا کرتا ہوں جس میں ایک ٹائپ کے سب گھر نہ صرف ناک نقشے بلکہ اینٹ گارے تک میں کانٹے کی تول برابر ہوتے ہیں۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے، اب تو مقالے کی جلد دور سے دیکھ کر معلوم پڑ جاتا ہے کہ یہ کس تعمیراتی کمپنی کا شاہکار ہے اور ماہرِ تعمیرات کون ہے، کہاں ہے، کس طرف کو ہے، کدھر ہے۔

سٹیریوٹائپ تحقیقی مقالات کے ہجوم میں اردو میں لسانی تحقیق ایک بالکل منفرد اور قرار واقعی ٹھوس ریسرچ ہے۔ اِس دعوے کا ثبوت اِس کتاب سے کوئی بھی ٹاپک پڑھ کے لیا جا سکتا ہے۔

لیکن نگاہِ خطا بیں کے حامل اِس خطا کار کی بدگمانی ابھی ختم نہ ہوئی تھی۔ کہاں اِس قدر بھرپور تحقیقی کام اور کہاں ایک ایسی محقق جس کا کبھی نام سنا نہ کہیں کوئی مقالہ چھپا دیکھا! خدا معاف کرے، ایک روز میں نے با قاعدہ نیت باندھ کے اور کمال سنجیدگی کی اداکاری کرتے ہوئے فائزہ سے شرارۃً کئی سوال پوچھے۔ اُن کو اُس وقت تو سمجھ نہ آئی لیکن یہ میں ہی جانتا ہوں کہ اُنھیں ڈیفنس وائیوا میں کیا دانتوں پسینہ آیا ہوگا جو اِس اداکاری میں رول ادا کرتے ہوئے آیا تھا۔ بہرحال مجھے یقین کرتے ہی بنی کہ نہ صرف عزیز صاحب نے اپنی لائق شاگرد کی qualified تعریف کی ہے بلکہ فائزہ نے اپنے میٹور خواجہ محمد زکریا صاحب کا مان اور اعتماد بھی فزوں تر کیا ہے۔ یہ تو کہیں بعد میں معلوم ہوا کہ فائزہ نے دورانِ تحقیق بنیادی مآخذ کی لیپ اور ترنگ میں Linguistic Survey of India تک چاٹ ڈالا تھا۔ جو سکالر سکالرہ LSI کو صرف چھونے کا یقین دلا دے میں اُسے اردو کی آبرو اور لسانیات کا سنجیدہ طالبِ علم تصور کرتا ہوں۔ اردو میں لسانی تحقیق پر لکھنے کا محرک بھی یہی بنا کہ ساری کتاب میں سرگریزن روح کی طرح موجود ہیں اور لائق مصنفہ اُن کا حوالہ جگہ جگہ دیتی ہیں۔

☆

اردو میں لسانی تحقیق کو پہلے شماریاتی پیمانے پر سرسری دیکھ لیتے ہیں کہ اس کا ڈھب اور ڈھچر کیا ہے۔ کتاب میں پانچ باب ہیں۔ پہلے باب ''لسان اور لسانیات'' کا پہلا حصہ نطق اور آلۂ نطق اور زبان اور بولی میں فرق کی روایتی بحثوں کو ایک توانا اسلوب میں تحقیق و تجزیے کے ساتھ پیش کرتا اور زبان کی پیدائش و پرداخت سے متعلق ہیاکلِ زبان کے نظریات سے بحث کرتا ہے جب کہ دوسرے حصے میں لسانی مطالعے کی ابتدا سے لے کر لسانیات کے با قاعدہ ایک شعبۂ علم کے طور پر سامنے آنے اور دیگر شعبہائے علم میں اِس کی حیثیت اور تعلق پر دادِ تحقیق دی گئی ہے۔ دوسرے باب ''دنیا کی زبانیں'' کے پہلے حصے میں دنیا بھر کی زبانوں کو برائے مطالعہ خاندانوں میں تقسیم کرنے کے عمل پر گفتگو ہے اور زبانوں کی صوری و نسلی تقسیم کا مطالعہ پیش کیا گیا ہے جب کہ دوسرے حصے میں ہند آریائی زبانوں کا خصوصی جائزہ لیا گیا ہے اور اِس میں آریاؤں کے ہند میں آنے، اُن کی زبان کے ارتقاء، اور آریائی زبانوں کے عہد ہائے قدیم، وسطی و جدید پر بحث کی گئی ہے۔ تیسرے باب ''اردو میں مستشرقین کی لسانی تحقیقات'' میں اہلِ یورپ کی شرق شناسی اور اردو زبان کی طویل و توانا علمی روایت، اردو کے مستشرق لغات نویسوں، قواعد نگاروں اور ماہرینِ لسانیات کی خدمات کا تحقیقی جائزہ لیا گیا ہے۔ چوتھے باب ''اردو لسانیات (ابتداء و ارتقائے اردو)'' میں زبانِ اردو کی پیدائش و پرداخت کے عمومی قیاسی نظریات، نیم سائنسی نظریات اور لسانی تحقیق پر مبنی جدید نظریات کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے اور ہر بحث کو سمیٹتے ہوئے نہایت

سامنے کے الفاظ میں اپنا تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ اِس باب میں فائزہ کی تحقیقی نظر اور تجزیاتی ذہن کی ایکا نگی پرنیں لیتی نظر آتی ہے۔ پانچویں باب ''اردو لسانیات (قواعد ولغت کے مباحث)'' کے پہلے حصے میں قواعد اور اُس کی اقسام اور اردو میں قواعد نگاری پر تفصیلی گفتگو ہے جب کہ دوسرے حصے میں لغت ولسانیات کے باہم تعلق، لغت کی اقسام، تدوینِ لغت کے محرکات اور اردو میں لغت نویسی پر دادِ تحقیق دی گئی ہے۔ اِن پانچ ابواب کے بعد ''پایانِ کار'' میں فائزہ نے اپنے تحقیقی کام کا Self-Appraisal کیا ہے۔ سوا سولہ صفحات پر پھیلی اِس کارگزاری میں جو نہایت سنبھلے ہوئے قلم اور آر پار مزاج کے ساتھ لکھی گئی ہے، باوقار فائزہ کی Self Esteem بھی عروج پر نظر آتی ہے اور اُسی لمحے اِس تحریر کی قبا بھی اردو میں لسانی تحقیق پر نہایت چست بیٹھتی ہے۔ اصول ہے کہ اپنے کام کو خود جانچنے والا ہمیشہ جھکتا ہی تولتا ہے، اردو میں لسانی تحقیق کے آخری باب ''پایانِ کار'' کا استثناء اِس اصول کو درست ثابت کر رہا ہے۔

☆

تحقیق ماضی میں لیے جاتی ہے جب کہ تجزیہ حال و مستقبل کی جولان گاہ ہوتا ہے۔ اردو میں لسانی تحقیق کے مطالعے سے فائزہ کے تحقیقی مزاج میں چار چیزیں بہت واضح محسوس ہوتی ہیں: مثبتیت، مستقبلیت (Futuristic approach)، کارآمدیت، اور سماج سے جڑاؤ۔ یہ چاروں رویے ایک طرح سے اُن کی عادتِ ثانیہ نظر آتے ہیں۔ آیئے اِس مزاج شناسی پر تھوڑی بات کرلیں۔

فائزہ نے پوری کتاب میں ہر بحث کو سمیٹتے ہوئے مختلف نظریات اور نظریہ سازوں سے اختلاف کیا ہے اور ہر ایک کے بارے میں اپنا اختلافی (یا تائیدی) نقطۂ نظر بھرپور، واضح الفاظ میں بیان کیا ہے، لیکن اِس بیان میں کہیں منفیت در نہیں آتی۔ یہ دعویٰ بہت آسان ہے لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ تحقیق نگاری میں اِس اصول پر قائم رہنا تنے ہوئے رسے پہ چلنے سے بھی زیادہ مشکل ہے۔ ایک ذرا کسی نظریے کے لیے یا کسی من چاہتے مصنف ومفکر کے لیے اصول کی تکڑی میں تولہ ماشہ کمی یا بیشی کر دی تو سارا کام اپنی ہی نگاہ میں ساقط الاعتبار ہو جاتا ہے۔ یہ مزاج کی مثبتیت ہی ہے کہ فائزہ اپنا حکم لگانے کے بجائے داخلی تضاد یا مصنف کے اپنے خیال یا نظریات کے بدلاؤ ہی کو تیز نگاہی سے تلاش کر لیتی ہیں جس سے تحقیق وتجزیہ نہ صرف بے غبار ہو جاتا ہے بلکہ بارِ ثبوت بھی مصنف پہ منتقل ہو جاتا ہے۔ یہ انداز ساری کتاب میں برابر ملتا ہے۔ فال نکالنے کے انداز میں کتاب کو کھولا تو صفحہ 375 سامنے تھا جس پہ اردو کے مستشرق ماہرینِ لسانیات کے عنوان کے تحت سر گریرسن کا ذکر مکمل ہو رہا ہے۔ یہ بتاتے ہوئے کہ گریرسن نے اردو کی ابتدا کے بارے میں اپنے تصور کے غلط ہونے کا اعتراف کر کے اپنی رائے سے رجوع کیا اور اردو کو بالائی دوآبے اور مغربی روہیل کھنڈ کی ہندوستانی پر مبنی قرار دیا، فائزہ اپنا نقطۂ نظر صرف ایک جملے ''گریرسن کا یہ فیصلہ سائنسی مطالعے کا نتیجہ ہے اور صحیح ہے، پہلا فیصلہ تاثراتی تھا اور غلط تھا۔'' میں بتا کر بحث کو مکمل کر دیتی ہیں۔

فائزہ تحقیق کے ماحصل کو ماضی میں دھکیل کر اپنے کام کو خواص پسند نہیں بننے دیتیں بلکہ اپنی مزاجی Futuristic approach کی وجہ سے گفتگو کا رخ عوام اور سماج کے لیے کارآمد کسی سمت میں موڑ دیتی ہیں۔ چنانچہ وہ سارے موادِ تحقیق کو ہمہ وقت اِس نگاہ سے آنکتی رہتی ہیں کہ میرا کیا ہوا کام نہ تو کسی جگہ جمود کا شکار ہو اور نہ تحقیق برائے تحقیق کے دائروی سفر میں کھو کر رہ جائے، بلکہ اِسے آئندہ کے لیے کارآمد ہونا چاہیے۔ مثال کے لیے میں نے کتاب کے چوتھے باب کے اختتام پر فائزہ کے Concluding پیراگراف کو دیکھا۔ یہ باب اردو زبان کے شجرۂ نسب، پیدائش اور آنول نال گڑے ہونے کے مقام کے بارے میں بڑے بڑے لسانی پہلوانوں کے باہم چھتیس کا آنکڑا خیالات کی لمبی بحثوں کے بعد مکمل ہو رہا ہے۔ فائزہ نے کسی نام اور کسی کے کام سے مرعوب ہونا تو الگ رہا، زبان کی پیدائش پر اپنا نظریہ قائم کرتے ہوئے اِس پورے شعبۂ علم (Discipline) کے وجود پر ہی سوال اٹھا دیا ہے۔ وہ اپنا Concluding پیراگراف معصومیت سے بھرے اِس سفاک جملے سے شروع کرتی ہیں:

''اردو کا آغاز کب ہوا؟ بہ ظاہر یہ سوال بے معنی ہے۔ دنیا کی کوئی بھی زبان تاریخ کے کسی نقطے سے شروع نہیں ہوتی بلکہ رفتہ رفتہ ارتقا پذیر ہوتی ہے۔'' (ص-530)

اِس قاتل معصومیت سے بھرپور جملے سے شروع کر کے وہ اپنے عالمانہ تجزیے کو اِس سادہ سے جملے پہ ختم کرتی ہیں:

''یہ کوئی ریاضی کا کلیہ نہیں کہ اخذ کر لیا جائے، اِس سلسلے میں تحقیق و تنقید کا عمل جاری رہتا ہے۔'' (ص-530)

یعنی حد ہو گئی۔ ماہرینِ لسانیات اپنی ساری ساری زندگی کی تحقیق کے بعد بنائے گئے اردو کی ابتدا کے نظریے پیش کر کر کے ہانپ گئے ہیں اور محترمہ کہتی ہیں کہ یہ سوال ہی بے معنی ہے کہ اردو کا آغاز کب ہوا اور کہاں سے ہوا۔ پنجابی کی کہاوت یاد آتی ہے کہ مرغی جان سے گئی اور کھانے والے کو سواد نہ آیا۔

عرض یہ کرنا ہے کہ اِس کتاب کی سب بحثوں میں یہ والی بحث دقیق ترین اور سب سے زیادہ الجھے ہوئے موضوع پر ہے اور فائزہ نے اِسے، میر کے الفاظ میں، خواص پسند بنانے کے بجائے عوام سے گفتگو کرتے ہوئے، یوں مزے مزے سے سمیٹا سماٹا ہے کہ یہ بوجھل محسوس نہیں ہوتی اور قاری ہشاش بشاش ہو کر اٹھتا ہے۔ اردو کے جنم بھوم کی جلیبی جیسی بحث کو بھی جسے باوجود کرنے والا ہر ذرہ اپنی جگہ آفتاب ہونے کا یقینِ کامل رکھتا ہے، ''پر مجھے گفتگو عوام سے ہے'' والے اسلوب میں سمیٹنے پر فائزہ باقاعدہ داد کی مستحق ہیں۔

فائزہ کے بشاشت شار اسلوب کی ایک مثال اور لیجیے۔ ڈاکٹر گیان چند جین کے ایک غلط فہمی کی بنیاد پر دکن میں اردو کی پیدائش کے قضیے کو زبردستی نصیر الدین ہاشمی کے سر باندھنے کا ذکر کرتے ہوئے فائزہ کہتی ہیں:

''ظاہر ہے دکن میں منتر پڑھ کر ایک دم ہی سے اردو کا آغاز تو ہوا نہیں ہوگا۔ یقیناً اِک عرصہ وہ بول چال کی سطح پر رائج رہنے کے بعد ضبطِ تحریر میں لائی گئی ہوگی جیسا کہ زبان کے ارتقائی مراحل میں ہوتا ہے۔'' (ص-449)

بات کو منطقی انداز میں سمجھانے اور اِس طرح سے سمجھانے کہ عام ذہنی سطح کا انسان بھی پورے طور سے مطمئن ہو جائے، فائزہ کے اسلوب کا اعجاز ہے۔ یاد رہے کہ فائزہ ایک محقق ہیں جنھیں ادب دار ہونے کا دعویٰ ہی نہیں ہے۔

مطالعہ و تحقیق کے بعد فائزہ کو صرف اپنی آزاد رائے دینے یعنی اپنا حاصلِ مطالعہ بتانے کے بجائے اُس پر اپنا نظریہ قائم کرنے کی دبنگ عادت ہے۔ چنانچہ تحقیق کے بڑے بڑے پہاڑوں پر مشتمل اِس کتاب میں جگہ جگہ سرسبز وادیاں ہیں جہاں آتے ہی ایک دم فرحت بخش ہوا کا احساس ہوتا ہے۔ یہ وہ جگہیں ہیں جہاں لوگوں کے اقتباسات اور اُن کی باتیں ختم ہوتے ہیں اور فائزہ اپنا نقطۂ نظر بیان کرنے یا تجزیاتی رپورٹ پیش کرنے لگتی ہیں۔ میں نہیں کہتا کہ فائزہ صاحبِ اسلوب لکھارن ہیں لیکن یہ ضرور کہتا ہوں کہ وہ مشکل ترین اسلوب یعنی بلغ العلائی اور ابوالکلامی اردو سے لے کر اردو کے بنیادی اسلوب یعنی مولوی عبدالحق تک سب میں یکساں روانی سے لکھ سکتی ہیں۔ اُن کی تحریر میں لفظوں کے معنی کی کئی سطحیں ہوتی ہیں اور محاورہ بندھا ہوا، اور ایسا رچاؤ ہوتا ہے کہ خود کو پڑھوا کر چھوڑتا ہے۔

☆

نقطۂ نظر بیان کرنے اور نظریہ قائم کرنے میں فرق ہے۔ نقطۂ نظر کا مطلب ہے کہ جو کچھ آنکھوں کے سامنے ہے اُس پر کمنٹ یا رننگ کمنٹری کر دی جائے۔ اِسے صحافیانہ رپورٹنگ کہہ لیجیے۔ نقطۂ نظر بار بار بدلتا ہے اور ایسا ہونا فطری ہے۔ نظریہ قائم کرنے سے میری مراد ہے کہ کئی فروع رکھنے والے ایک بڑے موضوع پر بہت سے نقطہائے نظر کی تفہیم و تجزیے کے عمل میں سالہا لگانے کے نتیجے میں اپنا طرزِ خیال یا ذہنی شاکلہ (Mindset) بنانا۔ سوچ سمجھ کر اور طویل تجربے کی بھٹیوں میں پکا کر بنا/ بنایا ہوا ذہنی شاکلہ بھی ارتقاء پذیر رہتا ہے اور ٹوٹ پھوٹ کا شکار بھی، لیکن عام طور سے بقیہ ساری زندگی اِس میں انقلابی تبدیلی نہیں آتی۔

اردو میں لسانی تحقیق میں زیرِ تحقیق لائے گئے ہر موضوع پر فائزہ نے اپنی آزاد رائے قائم کی اور اُسے پورے اعتماد سے لکھا، اور اپنی مختلف رایوں سے اپنے نظریات قائم کیے۔ آپ فائزہ کی رائے اور نقطۂ نظر سے اختلاف کر سکتے ہیں لیکن اُن کے قائم کیے ہوئے نظریے کے مقابلے میں نیا نظریہ قائم کرنا پڑے گا، جو بہت توجہ اور مطالعے کے ساتھ ساتھ طویل ریاضت مانگتا ہے۔

فائزہ کے قائم کیے ہوئے صرف چار نظریات کا یہاں پر چلتے چلاتے ذکر کیے دیتا ہوں۔ اِس موضوع پر باقاعدہ تحقیق

کرائی جاسکتی ہے کیونکہ اِس کنویں میں خاصا تیل ہے اور جوں جوں کتاب آگے بڑھتی ہے، فائزہ کے قائم کردہ نظریات میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ میں نے اِس عنوان پر مثالیں دینے کے لیے کتاب کے پہلے اور چوتھے باب سے دو دو عنوان منتخب کیے ہیں۔

اِس سوال کے جواب کے لیے کہ زبان کی فطری تشکیل کیسے ہوتی ہے، لسانی تغیرات اور انحرافِ زبان (سہولت کے لیے گرامر کی تشکیل، قواعدِ زبان، اور discourse وغیرہ میں در آنے والی تبدیلیاں) کے موضوعات پر سابقین نے دادِ تحقیق دی ہے اور اپنے علم و مطالعات کی روشنی میں اپنے نظریات قائم کیے ہیں۔ جارج برنارڈ شاء لسانی تغیرات کی وجہ ثقافتی مظاہر اور معاشی سرگرمی کو سمجھتے ہیں[1]؛ رشید حسن خاں کے نزدیک اِس کی وجوہات میں زبان کے تحریری نظام کی طرف بے توجہی ہے[2]؛ جنابِ شان الحق حقی اِس کا سبب خاندانی نظام بتاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مرد باہر کام پر جاتے ہیں اور عورتیں گھروں میں رہتی ہیں اِس لیے اُن کی زبان خالص تر ہوتی ہے جب کہ مردوں کی زبان میں ملاوٹی عناصر شامل ہوتے جاتے ہیں، لیکن اب چونکہ عورتیں بھی مددِ معاش کی سرگرمی میں شامل ہوگئی ہیں اِس لیے مردوں اور عورتوں کی زبان میں کا فرق کم ہوتا جائے گا[3]، یعنی Language purism بھی خواب بن جائے گا اور اندرونی اختلافات (internal variability) کی وجہ سے رفتہ رفتہ زبان کی نئی تشکیل وجود میں آجائے گی۔ فائزہ کے نزدیک لسانی تغیرات کا سبب بچے کا ماحول اور پرورش ہے۔ کہتی ہیں:

''صوتی، قواعدی اور لغوی سطح پر بچے کی زبان متعدد مگر لطیف انحرافات ظاہر کرتی ہے جو بعد ازاں نسل در نسل پروان چڑھتے ہیں اور انحرافِ زبان کا سبب بنتے ہیں۔'' (ص-16-17)

اِس اجمال کی تفصیل یعنی فائزہ کا نظریۂ انحرافِ زبان (یا زبان کی فطری تشکیل) سمجھنے کے لیے متذکرہ اقتباس سے لے کر صفحہ 31 بلکہ 35 تک دیکھیے۔

زبان اور بولی کے فرق پر فائزہ نے عمدہ بحث کی ہے اور علی الخصوص بولی کی معیار بندی پر وقیع خیالات پیش کیے ہیں۔ اِس بحث کے دوران اُنھوں نے بولی کی پیدائش پر اپنا مضبوط نظریہ پیش کیا ہے۔ کہتی ہیں:

''زبان میں کسی بھی نوع کی تبدیلی اگر قومی سطح پر پوری زبان کو متاثر کرنے میں کامیاب رہے تو نئی بولیوں کی آفرینش کا عمل رک جائے گا۔ اِس کے برعکس اگر نئے تصورات کی درآمد کا سلسلہ پوری زبان کے بجائے کسی مخصوص علاقائی حدود میں مستعمل زبان کو متاثر کرے تو بولی جنم لے گی اور انحرافِ زبان سے متاثر علاقہ نئی بولی کا علاقہ تصور کیا جائے گا۔'' (ص-35)

زبان اور بولی کے فرق کو ذہن میں رکھیے اور ملاحظہ کیجیے کہ زبان کی پیدائش اور وفاتِ حسرت آیات کے اسباب و

علل پر ماہرینِ زبان کا گفتہ بہت مقدار میں ملتا ہے تاہم بولی کے بارے میں ایسی دو جمع دو چار آر پار بات کم سے کم میرے مطالعے سے نہیں گزری۔ مجھے اپنا مطالعہ محدود ہونے کا اعتراف ہے۔ بولی ہر انسان اور گروہ کی اپنی اپنی ہوتی ہے اور سب سے زیادہ رچاؤ اِسی گفتے میں ہوتا ہے، لیکن اُسی لمحے یہ سب سے زیادہ vulnerable بلکہ volatile ہوتی ہے۔ (عجزِ بیان پہ معذرت کہ میرے پاس مافی الضمیر کی ادائیگی کے لیے صرف یہی تکنیکی بولی ہے نہ کہ ادبی پیرایۂ اظہار کے لائق مخصوص زبان؛ وجہ میری ٹیکنیکل شعبے سے وابستگی۔) انسان جائے تو بولی یوں غائب ہوجاتی ہے جیسے بٹن بند کرنے سے بجلی چلی جاتی ہے۔ ایک شعر کیا خوب اور برمحل یاد آیا:

جوگی کس سے بولے، دکھڑے من کے کس سے کھولے

بارہ کوس پہ بولی بدلے، تیرہ کوس پہ رِیت [4]

زبانِ اردو کی اِس مستقل لسانی بحث پر کہ اردو کی پیدائش کس علاقے میں ہوئی، فائزہ نے تمام اہم لوگوں کے نظریات کی جانچ کے بعد اردو کے مخلوط زبان ہونے نہ ہونے پر اپنا نظریہ قائم کیا ہے۔ لکھتی ہیں:

''اردو کے مخلوط زبان ہونے کا خیال صرف اس حد تک درست ہے کہ اس کا گنجینۂ لغت مختلف زبانوں کے الفاظ سے بھرپور ہے، البتہ اپنی ساخت اور بنیادی ڈھانچے کے حوالے سے وہ دیگر ہند آریائی زبانوں کی طرح باقاعدہ اپنا شجرۂ نسب رکھتی ہے اور قدیم ہند آریائی زبان سے اسے وہی نسبت ہے جو اس کی دیگر ہم عصر بولیوں کو ہے۔ اردو کے مخلوط زبان ہونے کا یہی غلط تصور متعدد پرتعصب علاقائی نسبت کے حامل نظریات کا سبب بنا۔'' (ص-485)

اردو کو مقامیانے یعنی پاکستان کے کسی شہر کی قدیم زبان قرار دینے کے شوقِ فضول میں دلائل و براہین جمع کرتے لوگوں کے متفرق و متضاد بیانات جو محققین کو مزید الجھا دیتے ہیں، کی بحث سمیٹتے ہوئے فائزہ نے ایک کمال نکتہ نکالا ہے کہ یہ ماہرینِ زبان مذہبی اور علاقائی تعصب رکھتے ہیں حالانکہ زبان کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ لکھتی ہیں:

''اِس سلسلے میں زیادہ تر ماہرین مذہبی اور بالخصوص علاقائی عصبیت کا شکار بھی ملے۔ اکثر ہندوستانی علما اُتر پردیش اور دہلی کے سوا کسی اور مقام کو اردو اور ہندی کا مرکز و منبع ماننے کے لیے تیار نہیں اور نہیں چاہتے کہ برج کی مقدس سرزمین اور اِس کے نواحی علاقے اِس عظمت سے محروم ہوجائیں اور اردو کے آغاز کا سہرا کسی اور خطے کے سر جا بندھے۔ اسی طرح پاکستانی علما کے ہاں اردو کو دراوڑی الاصل زبان تسلیم کیے جانے کا رجحان زیادہ اِس وجہ سے ہے کہ اِس نظریے کے مطابق اردو زبان کا تعلق پاکستان سے بن جاتا ہے۔ گویا اردو پاکستان کی قدیم زبان ہے۔'' (ص-529)

واضح رہے کہ زبان کو مذہب کے خدا خانے یا رام گھر سے مربوط نہیں کرنا چاہیے۔ مذہب کا ڈسکورس بولی ہوتی ہے نہ کہ زبان۔ زبان تو لا خدایان اور لا مذہبان بھی بولتے برتتے ہیں۔

نظریات سازی کی گفتگو کو ختم کرنے سے قبل اِس بات کا ذکر ضروری ہے کہ بسا اوقات قیاس کو نظریہ سمجھ لیا جاتا ہے۔ اِس فرق کو مستحضر رکھنے کی ضرورت ہے تاکہ خوامخواہ کسی پر کاکوا نہ بنایا جا رہا ہو۔ بہت خوشی ہوئی کہ فائزہ جیسی لائق محقق اِس باریک فرق کو بخوبی سمجھتی ہیں۔ اردو کی ابتدا کے بارے میں نظریات پر بحث کرتے ہوئے وہ اپنے Closing remark میں کہتی ہیں:

''واضح رہے کہ اردو کی پیدائش سے متعلق قریباً تمام قیاسی نظریات درحقیقت 'قیاسی بیانات' ہیں کہ جنھیں ضبطِ تحریر میں لانے والوں کا تعلق اردو ادب سے ضرور تھا مگر نہ تو وہ علم اللسان کے ماہر تھے اور نہ ہی لسانیاتی تحقیق کی زیادہ سوجھ بوجھ رکھتے تھے۔ لہٰذا اردو زبان کے آغاز و ارتقا کے حوالے سے اِن کے مباحث کی حقیقت 'نظریات' سے کہیں زیادہ 'قیاسات' کی ہے۔'' (ص-446)

چنانچہ فائزہ نے اپنے بھانویں زبان کے بارے میں پہلے سے موجود قیاسات کی فہرست میں کوئی اضافہ نہیں کیا بلکہ جہاں ضروری محسوس ہوا، اپنے نظریات کی روشنی میں ایک مستحکم رائے اور بیانیہ پیش کیا ہے۔ ہاں، بہتر دلیل ہمدست ہو جائے تو رائے سے اختلاف کیا جا سکتا ہے۔

☆

فائزہ کا ایک اصول پوری کتاب میں یکساں توانائی کے ساتھ ملتا ہے کہ بڑے کام اور بڑے علمی قد سے نظریاتی اختلاف کو بھی اس انداز سے کہا و لکھا جائے کہ ادب کی حد پار نہ ہو۔ چنانچہ سر سید احمد خاں اور سر گریئرسن سے لے کر مسعود حسین خاں اور گیان چند جین تک شاید ہی کوئی ماہرِ لسانیات ملے جس سے فائزہ نے اختلاف نہ کیا ہو، لیکن یہ اختلاف بانگِ گل کی سی نرمی سے ہوتا ہے۔ مثال کے لیے صرف سر گریئرسن کے بارے میں اُن کے الفاظ دیکھیے:

''... چناں چہ لسانی مطالعے کی وہ تحریک جس کا آغاز اردو زبان کے ماضی کی بازیافت کے حوالے سے عہدِ گلکرسٹ سے ہوا، جب جارج ابراہام گریئرسن کے دائرہ کار میں داخل ہوئی تو زبانوں کا مطالعہ لسانی رشتوں کو ٹٹولتا ہوا سنسکرت اور پراکرتوں کی حدوں سے اِس طرح جا ٹکرایا کہ Linguistic Survey of India میں علاقائی زبانوں کے مطالعے کی نسبت اردو فقط ایک جلد ہی میں سمٹ سکی اور اِس طرح اردو کے لسانی مطالعے کی توانا روایت پورے ایشیا کی لسانی تاریخ کا حصہ بن کر رہ گئی۔'' (ص-215)۔

میں نے سر گریئرسن کا LSI جنرل ضیا کے دور میں دیکھا تھا اور آج تک اس کی ضخامت ہی کے خیال سے جھرجھرا جاتا ہوں۔ فائزہ کا مندرجۂ بالا اقتباس LSI پر بلاشبہہ سنگین ترین تبصرہ ہے، لیکن ایسے افسانوی اسلوب میں ہے کہ گریئرسن خود بھی سن لے تو اِسے اپنی تعریف تصور کرے۔

☆

اردو میں لسانی تحقیق کی ایک ظاہر بظاہر خوبی اِس کی Readability ہے۔ تحقیقی مقالہ علمی اسلوب کی آڑ میں عموماً یبوست زدہ اسلوب میں لکھا جاتا ہے لیکن فائزہ کے اسلوب کے بارے میں یہ بات ذکر کر چکا ہوں کہ وہ خود کو بشاشت کے ساتھ پڑھوا کے رہتی ہیں۔ 721 صفحات کی اِس کتاب کے موضوعات ضرور خشک ہیں لیکن اسلوب میں سگندھ اور موسیقی کچھ ایسی رچی بسی ہے کہ پانچ کے پانچ باب ایک محفلِ موسیقی میں گائے پانچ کلاسیکل راگ معلوم ہوتے ہیں۔ اس دعوے کی صرف ایک مثال کے لیے اوپر والے اقتباس میں خط کشیدہ الفاظ پر غور کیجیے۔ مجھے تسلیم ہے کہ ہر صنف کی اپنی زبان اور اپنا اسلوب ہوتا ہے، اور تحقیقی مقالے کے لیے سادہ علمی زبان اور نپا تلا (Quantifiable) اسلوب ہی درست ہے، لیکن اردو میں لسانی تحقیق جیسے ضخیم تحقیقی مقالے کے کتابی صورت میں شائع ہونے پر وہی اسلوب مناسب ترین ہے جو فائزہ کا ہے خواہ کوئی اِسے افسانوی اسلوب کیوں نہ کہہ لے۔ مجھے کہنے دیجیے کہ اگر یہ اسلوب نہ ہوتا تو کتاب کی اشاعت بے فائدہ ٹھہرتی کیونکہ اسے کوئی قاری نہ ملتا۔ اگر یہ تحقیق صرف محققین کی کار برآر ہوتی تو بے شک کتاب چھپتی ہی نہ۔ بہت سے مقالے اشاعت کے لائق نہیں بھی ہوتے۔

اردو میں لسانی تحقیق کے بارے میں ملاحظے کی ایک بات ذکر کرنا چاہوں گا، اس درخواست کے ساتھ کہ اگر یہ کسی لائق ہو تو اِس پر غور کر لیا جائے، اور اگر میرا قصورِ فہم ہو تو معاف کر دیا جائے۔ فائزہ لکھتی ہیں:

> ''زبان کو زیادہ سے زیادہ معیاری بنانے اور بولیوں کے استیصال کی ارادی کوشش کبھی بھی کامیابی سے ہم کنار نہیں ہوئی بلکہ منظّم اور معیاری زبان ہی سے متعدد نئی بولیاں جنم لیتی ہیں۔'' (ص-40)۔

اِس جملے سے میں یہ سمجھا ہوں کہ فائزہ زبان کو ایک مجسم کلیت تصور کر رہی ہیں، جو بیشتر ماہرینِ زبان کے نزدیک درست نہیں۔

☆

پاکستان میں جہاں اردو لسانیات اردو کے آغاز اور جائے پیدائش کے دائروی نظریوں اور سرگزشتِ الفاظ جیسے کولھواڑ موضوعات تک محدود ہو گئی ہے اور علمِ زبان اور لسانیات تک میں فرق کرنے والا کوئی خال ہی خال ملتا ہے وہاں لسانی تحقیق کے موضوع پر انتہائی خاموشی سے بہت بڑا اور زندہ رہنے والا کام دیکھ کر مجھے سر گریئرسن بے اختیار یاد آتے چلے

گئے اور آنکھیں بھیگ گئیں۔ بے شک ایسا کام کرنے کے لیے سر گریئرسن والی پیہم لگن اور strong-headedness درکار تھی جو قدرت نے ایک خاتون کو ودیعت کر دی، اور میں اردو والوں کو خوش قسمت سمجھتا ہوں کہ وہ یہ کتاب دیکھ پائے جو کتابوں کی اُس الماری میں جگہ بنا گئی ہے جس میں سر گریئرسن کا LSI رکھا جاتا ہے۔ کتاب کی کئی بحثوں کو پڑھ کے احساس ہوتا ہے کہ لسانی مطالعات اور تحقیقات کی جو راہ سر گریئرسن نے ہموار کی ہے، فائزہ کا شمار اُس پر سنجیدگی سے چلنے والوں میں ہوتا ہے۔ مجھے خواجہ محمد زکریا صاحب کا شکریہ ادا کرنا ہے جو اردو میں لسانی تحقیق جیسی جاودانہ کتاب کے ظہور و وجود کا سبب بنے۔ انھوں نے حرف حرف درست لکھا ہے کہ:

''بڑی تعداد میں لکھے جانے والے حالیہ تحقیقی مقالات سے اس کا تقابل کیا جائے تو یہ مقالہ فراہمیِ مواد، ترتیبِ ابواب، علمی اسلوبِ تحریر اور استنباطِ نتائج کے اعتبار سے معیاری تحقیقی کام کی ذیل میں آتا ہے۔'' [5]

خواجہ صاحب نے یہ کتاب شائع کر کے ساری دنیائے اردو کو تشکر کے جذبات کے اظہار کا موقع دیا ہے۔

☆

اردو میں لسانی تحقیق اردو کے بارے میں لسانی معلومات ہی نہیں، علم کا بھی خزانہ ہے۔ اپنے موضوع پر خود مکتفی یہ کتاب جہاں علم کا گڑھ (Body of Knowledge) ہے وہیں مینارۂ نور کی طرح ایک انتہائی جدید و نفیس سمت شناس (Navigator) بھی ہے جو علم و معلومات کے جویاؤں کو چو طرف نئی سمتوں کا ٹھیک ٹھیک پتہ دیتا ہے۔ یہ کتاب اِس موضوع پر پچھلی کسی کتاب کو نہ تو replace کرتی ہے اور نہ کسی پچھلی کتاب کا ضمیمہ ہے۔ یہ ایک صائب الرائے محققِ زبان کے اردو زبان کے مختلف پہلوؤں پر قائم کیے ہوئے سنجیدہ اور Well-researched نظریات کا مجموعہ ہے، اور یہ آپ جانتے ہی ہیں کہ نظریات بنتے بنتے بنتے ہیں اور تبدیل بھی ہوتے ہوتے ہوتے ہیں۔

☆☆☆

تحریر: ۱۷/ نومبر ۲۰۱۷ء

تکمیل: ۱۷/ نومبر ۲۰۱۹ء

تشکر:

اِس مقالے کی تیاری کے دوران میں ڈاکٹر جاوید مجید کی کتابوں colonialism and knowledge in Grierson's Linguistic Survey of India اور Nation and Region in Grierson's Linguistic Survey of India پر ڈاکٹر طارق رحمان کے تبصرے (www.bloomsburypakistan.org؛ 4 نومبر 2019) سے بیش از بیش استفادہ کیا گیا ہے۔

حواشی:

اِس مقالے میں بقیدِ صفحہ نمبر جو بھی حوالے یا اقتباسات دیے گئے ہیں وہ ڈاکٹر فائزہ بٹ کی کتاب اردو میں لسانی تحقیق کے ہیں اِس لیے اِس کا ذکر حواشی میں نہیں کیا جا رہا۔ بقیہ حوالے مندرجۂ ذیل ہیں:

۱۔ www.jstor.org/stable/40682076

۲۔ اردو املا، رشید حسن خاں، نیشنل اکادمی، دریا گنج، نئی دہلی، بھارت، 1974، ص9

۳۔ نوک جھوک، شان الحق حقی، فیروز سنز لاہور، 2005، ص226

۴۔ پانی میں ماہتاب، عابد صدیق، دوسرا ایڈیشن، الحمد پبلی کیشنز، لاہور۔ 2006

۵۔ اردو میں لسانی تحقیق، فائزہ بٹ، مغربی پاکستان اردو اکادمی لاہور، 2017، پچھلا ٹائٹل